سلیم سرور

نَربل (افسانہ)

ملاقات ہو، شام میں ہو، مدتوں سے بچھڑے شاعر، ادیب، حساس دل کے مالک اور سندھی تہذیب کے باسی سے ہو تو دل اضطراب کی تمام حدوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا، ریت کے ہلکے پھلکے چھٹے، کوئی اکادکا موٹر سائیکل کی آمد و رفت مگر یہ سب چیزیں میرے لیے دلچسپی سے خالی تھیں۔ میں تو مجنوں کی طرح دنیا سے بے نیاز اپنی لیلہ کے خیالوں میں گم چلتا جا رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ ٹھٹھہ ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شام اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور فضا میں نمی گھلنے لگی تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑے بوڑھے نیم کے درخت ہوا کے ساتھ ایسے سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے کسی کھوئی ہوئی داستان کا نوحہ دہرا رہے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ فضا کی سرگوشیاں بھی نہ صرف قابلِ سماعت ہیں بلکہ قابلِ فہم بھی ہیں۔ سامنے دور ریلوے لائنیں دھند میں گم ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک یوں لگا جیسے یہ پٹریاں لوہے کی نہیں، وقت کی بنی ہوئی ہیں، جو سیدھی مجھے صدیوں پیچھے لے جا رہی ہیں۔ میرے قدم حال میں تھے مگر ذہن ماضی کے ویران محلوں میں بھٹکنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ساموئی کے مقبروں سے پرانی صدائیں اٹھ رہی ہوں، جیسے مغل سپاہیوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں اب بھی ان گلیوں میں گونج رہی ہیں۔ گھوڑوں کو حکم دیا گیا ہو، جاؤ، غریبوں سے رزق چھین لاؤ اور ان کی زبانوں پر تالے لگا دو اور اگر کوئی چوں چراں کرے تو اسے سموں تلے روندھ ڈالو۔ اس تحکمانہ پیغام نے پوری فضا کو سرِ شام ہی سلا دیا ہے۔ اور شاہجہانی مسجد کے میناروں کی سطوت اس بات کی غماز ہے کہ وقت آج بھی بلندی پر ٹھہرا ہوا ہے۔ زیریں علاقوں تک پہنچنے میں مزید کچھ خونی شاموں تک کا فاصلہ باقی ہے۔

خونی شام، چپٹا لہو، گونگی بارش، میرے ذہن میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک تکرار سی بندھ چکی تھی۔ میں چاہتا تھا ان ناموں سے نجات پاؤں تاکہ چند ساعتوں کے بعد ہونے والی ملاقات کا حظ اٹھانے کے لیے دل و دماغ یکساں تراوت کا اظہار کریں۔ بے ساختہ میرے ذہن سے کچھ آوازیں ابھریں، شادمانی کا سامان کیا جاتا ہے اور پھر اس سے حظ اٹھانے کے لیے بھی دل و دماغ تیار کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو لطف اندوزی پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ غم ایک ایسا تیز ہوا کا جھونکا ہے جو خود راستہ بناتا ہوا نہاں دریچوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر غم سے نجات مشکل نہ ہوتی تو کاملانی صاحب اپنے شعری مجموعوں کو ''چپٹا لہو''، ''گھٹی ہوئی فضا'' اور ''گونگی بارش'' جیسے نام نہ دیتے۔ ویسے یہ تو میری اختراع ہے کہ میں نے ان عنوانات کو بلاواسطہ غم سے جوڑ دیا، ممکن ہے کاملانی صاحب خود خوش باش انسان

ہوں۔ بات تو توجہ طلب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنی ذات کا ترجماں نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے اور حتیٰ کہ پوری دنیا کا آئینہ ہوتا ہے۔ شاعر کی خوشیاں بھی شاید گونگی ہوتی ہیں اور وہ بھی نمود و نمائش کیے بغیر چپکے سے میرے سفر کی طرح گزرتی جاتی ہیں۔

میں چلتا جارہا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ ٹھٹھہ کے اندر کئی شہر آباد ہو چکے ہیں۔ اس شہر میں تقسیم، تفریق اور ضرب کے تمام اصول اپلائی ہو چکے ہیں اور جو اصول کارگر نہیں ہوا یا اپلائی نہیں ہوا وہ جمع کا اصول ہے۔ مجھے کسی ایک عمارت یا چیز پر اپنی نگاہوں اور سوچ کو مرتکز کرنا اتنا ہی مشکل ہو رہا تھا جتنا کسی چرواہے کے لیے پہلے روز بکریوں کو ایک سمت چلانا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے یاد آنے لگا کہ یہی ٹھٹھہ کبھی علم، تجارت اور تہذیب کا شہر تھا؛ یہاں دور دراز سے قافلے آتے تھے، دریائے سندھ کے کنارے کشتیاں لنگر انداز ہوتیں، اور راتوں کو چراغوں کی روشنی پانی پر کانپتی رہتی تھی۔ واہ وہ عبدالطیف بھٹائی کا دربار، وہ علم و حکمت کا منبع، وہ بوڑھی نیامت بی بی، وہ شاہ جو رسالو، سب کچھ مجتمع ہو کر فریم سا ہو کر مجسم ہو گیا۔ دلِ دیدہ بینا دیکھ رہا ہے کسی قدیم سرائے کے دروازے پر ایک تھکا ہوا درویش بیٹھا فارسی میں کوئی شعر پڑھ رہا ہے۔ پھر اچانک ایک عجیب اداسی نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے سوچا، ''کتنی عجیب بات ہے... شہر بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر مرتے نہیں، صرف ان کے لوگ مر جاتے ہیں، ان کی آوازیں خاموش نہیں ہوتیں۔'' ریلوے اسٹیشن اب قریب تھا، مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ تاریخ کے ملبے پر چل رہا ہو، جہاں ہر اینٹ اپنے اندر ایک دفن زمانہ لیے بیٹھی ہے۔

کچی مٹی سے بنی ہوئی چائے والی بھٹی کے پاس کھڑا ہوا ادھیڑ عمر کا چچا، اونچی آواز میں، '' سائین، چانھہ کُہِي وٹِي آ'' چچا میں چائے پینے نہیں بلکہ مشتاق کاملانی صاحب کے مکان کا پتہ پوچھنے آیا ہوں۔ آخری بار جب ہمارا رابطہ ہوا تھا تو انہوں نے ''شور کوٹ اور لالہ موسیٰ ریلوے ٹریک'' اس طرح کا کچھ پتہ لکھا تھا تاہم وہ خط مجھ سے گم ہو گیا ہے۔ پتر ''شام تو بعد اس جا پر دو ہی چیزیں رہ جاتی ہیں ایک ریلوے پٹڑی اور دوسرا کملا کاملانی''۔ آپ کا کیا مطلب؟ ان کا گھر۔۔۔۔؟۔ پتر ''گھر کجا اس بے چارے کا کوئی پرسان حال بھی نہیں ہے''۔ اتنا بڑا شاعر، ادیب جو صرف اردو زبان نہیں بلکہ سندھی میں بھی لکھتا ہے اور انگریزی ادب کو بہت اچھے سے سمجھتا ہے۔ دماغ دو صدیاں پیچھے میر تقی میر کے دور میں جا پہنچا، جہاں شعر زمین و آسمان کی وسعتوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اور بندہ آگرہ ریلوے سٹیشن پر ریل کے کرائے سے محروم کھڑا تھا۔ ریلوے ٹریک سے ذرا نیچے کی طرف چلا تو سامنے مٹی میں ملگجی ہوا پڑا مورتی مجسمہ۔۔۔۔۔

دو کالے کلوٹے اور سوکھے سڑے بچے سائیکل نما فریم پر سوار، نیچے کی طرف جا رہے تھے، مجھے لگا، ملگجی فقیر اٹھ کر ایک طرف ہو جائیں گے مگر میرا خیال تب یکسر غلط ثابت ہوا جب دونوں بچے سائیکل سے نیچے اتر کر سڑک کے دوسرے کنارے پر جا لگے

مگر وہ فقیر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ملنگی فقیر کے دائیں جانب مشرق کی سمت منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مگر وہ شاید گہری نیند سو رہے تھے یا پھر کسی نشے کے زیر اثر دوسری دنیا کی سیر پر تھے۔ سفید بال، جن میں قریب قریب دو ہفتے پہلے کالا رنگ پوچا گیا تھا۔ سفید داڑھی جو مصنوعی کالی رنگت کے اڑ جانے پر بھوری ہو چکی تھی بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ خاک آلودہ داڑھی میں سے بھورے بال جھانک رہے تھے۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، کھال بہت حد تک خشک ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں کی رنگت اور بالوں کا الجھاؤ بتا رہا تھا کہ آخری بار نہائے مہینے بیت چکے ہیں۔ بادامی رنگ کی قمیص اور سفید شلوار کا دھول نے اپنے جیسا ہی رنگ کر لیا تھا۔ انسان دنیا کی سب سے قیمتی چیز اور باوقار مخلوق ہے جو جیتے جی مٹی کو اپنا مسکن بنانا تو کجا، مٹی جسم پر لگنا بھی تضحیک سمجھتا ہے۔ جام شورو یونیورسٹی، علی بابا، استاد میر علی، ادب کا شعبہ اور ملنگی فقیر، اگر میرا روحانی تعلق نہ ہوتا تو ان کو پہچاننا میرے بس کی بات نہ تھی۔

''چپٹا لہو'' کا شاعر آج بالکل چپٹا ہوا پڑا تھا جس میں ایک بھی پھیر نہ تھا۔ جسم کا لہو بھی کافی حد تک چپٹا ہو چکا تھا، کہنے کو تو وہ زندہ تھے کیوں کہ جس انسان کی سانسیں چلتی ہیں اور خون کا بہاؤ ہے وہ زندہ ہے۔ مگر جب خون کی قدر، کشش اور قیمت نہ رہے تو وہ کسی قدرتی چشمے کا روپ دھار لیتا ہے۔ جو بہتا، سیراب کرتا ہے مگر اس کا والی وارث کوئی نہیں ہوتا، یہ شاعر گئے دنوں میں پوری سندھی تہذیب اور قوم کا نہ صرف نباض تھا بلکہ ترجماں بھی تھا اور آج اتنا بے بس کیوں؟ دنیا میں عزت، قدر اور مرتبے صرف اجلے کپڑوں، چمکتے چہروں اور سیاہ شیشوں والی لمبی لمبوتری گاڑیوں کا مقدر ٹھہرا! حساس طبع لوگوں کا مقدر اپنے اور اپنے جیسوں کے غم میں گھل گھل کر مرنا لکھا ہے یا ان کی کوئی عزت بھی ہے؟

کاملانی صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

''لگتا ہے کوئی شاعر یا ادیب آن پہنچا ہے؟''

جناب! ہم کہاں کہ ادیب ٹھہرے، بس قلم چلاتے ہیں اور سیدھی اور کچھ ترچھی لکیریں کھینچتے رہتے ہیں۔

ارے صاحب! ''ادیب یا شاعر لفظوں کے پیچ تاب یا کہانی کے بناؤ سنگھار سے نہیں بلکہ جذبات اور احساسات سے پہچانا جاتا ہے۔ سارا دن میں ادھر ہی پڑا رہتا ہوں، کبھی کسی نے حال تک نہیں پوچھا۔ اگر مجھے اب بھی کوئی پہچانتا ہے تو وہ یقیناً اس سماج کا صرف اور صرف حساس دل رکن ہی ہو سکتا ہے۔

کاملانی صاحب! ہم تو آپ کو ان دنوں سے پہچانتے ہیں جب آپ لچکتی ہوئی بوسکی کی قمیص اور کڑکتی ہوئی لٹھے کی شلوار پہنا کرتے تھے، یہاں بس نہیں بلکہ ہم جیسے ادب پسند نوآموز کہانی کاروں کو ڈھابوں پر بٹھا کر نہ صرف اپنے شعر سنایا کرتے تھے بلکہ

انگریزی، فارسی اور سندھی ادب کی قدیم تاریخ سے واقفیت دیا کرتے تھے۔جب آپ گھنٹوں مجلس جمانے کے بعد چلے جاتے تو میں، صادق، لطیف اور رفاقت مل کر باتیں کیا کرتے یہ شاعر بہت جلد کوئی تاریخ رقم کرے گا۔

ارے صاحب! ''یہ آپ کی محبت ہے ورنہ ہم تب بھی آج کی طرح خاک نشین ہی تھے۔''

کاملانی صاحب ایسی باتیں آپ کے منہ سے ہی اچھی لگتی ہیں کیوں کہ اصل خاک نشین وہی ہوتا ہے جو خاک، خاک سے بننے والے انسان اور تہہ خاک تک کی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔

''بات تو ٹھیک ہے ورنہ ہم بھی آج مادے کی پہچان اور مادیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوتے اور انسانیت کا نوحہ سرزبان لانے والا کوئی بھی نہ بچتا! جس طرح فطرت کا اصل ہے کہ تمام انسان برابر نہیں ہو سکتے بالکل اسی طرح حساس اور سنگ دل ،کمزور اور طاقتور ظالم اور مظلوم برابر نہیں ہو سکتے۔

جس طرح یہ شام تاریک رات میں بدل چکی ہے۔اسی طرح طاقت ور کمزور کو اپنے حصار میں لیتے ہیں اور ان کے اس کھیل کو دیکھ کر سورج نے رات کے کناروں سے لپٹ کر آہستہ سے سرگوشی کی ہو گی، دونوں پلڑے برابر نہ ہونے دینا، میں نے سارا دن کچھ لوگوں کو سایہ نہیں دیا اور ان کو اپنی تپش سے خوب جلایا ہے۔اب تیرا کام ہے، ایسی ہوا چلا کہ مٹی اور ریت کے ذرات باہم متشکل ہو کر رات بھر طعنوں کی صورت منہ پر پڑتے رہیں۔

کاملانی صاحب! بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی، جام شورو یونیورسٹی کے مشرقی دروازے کے سامنے وسیع ریگزار جہاں مئی کی ایک صبح ایک طوفان اٹھا تھا اور ہم پانچ دوست اس میں پھنس گئے تھے اور ہماری آنکھیں ریت کے ڈھیلے بن گئے تھے۔تب بھی آپ نے آج سے کچھ ملتا جلتا ہی کہا تھا۔''یار تم لوگ پتہ نہیں حقیقت سے کیوں کنارہ کشی کرتے ہو حالانکہ ہم لوگ اسی ریت سے نکلے ہیں اور یہی ہمارا مقدر ہے۔وڈیرے، کالے شیشوں والی بند گاڑیوں پر آتے ہیں، ہماری عزتیں، عصمتیں ریت کے انہی ذرات کی طرح ہوا میں بکھیر کر چلے جاتے ہیں، کبھی کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی تو پھر ذرا سی ریت بالوں اور آنکھوں میں پڑنے سے اتنے مضطرب کیوں ہو جاتے ہو''۔دوست زمانہ طالب علمی میں ہی آپ، ہم سے بہت آگے نکل گئے تھے۔آپ نے اپنے جسم اور جسم کی نمائشی اور آسائشی ضروریات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

ارے صاحب! ''اسی سوچ نے یہ حال کیا ہے ورنہ ذرا سا سمجھوتہ کرنا تھا اور کسی وڈیرے کے ڈیرے پر پڑے رہتے اور مفت کے لنگر توڑتے رہتے، بس صبح شام ان کی مدح میں کوئی ایک آدھ شعر تخلیق کرتے رہتے۔مگر پتہ نہیں کیوں ہم اپنے ضمیر کو اس کام کے لیے راضی نہ کر سکے اور ہمارا ضمیر اپنے ہی ہم جنسوں کا ماس کھانے کے لیے تیار نہ ہوا، بلکہ کبھی بھی تیار نہ ہو گا۔

''رولو''ناول آپ کی شاہکار تخلیق ہے، آج آپ اسی کے ہیرو مراد کی طرح خاک نشین ہیں۔اس میں ہیرو کو آپ نے شاعر بنایااور سماج کا مترجم بھی بنایا مگر اتنا غریب کیوں بنایا تھا؟ حالانکہ معاصر شاعر اور ادیب تو صاحب ثروت ہیں۔

کاملانی صاحب ہلکا سا مسکرائے۔وہ مسکراہٹ کسی شکست خوردہ سپاہی کی آخری ہنسی جیسی تھی۔

''صاحب! دولت مند ادیب اکثر لفظوں سے نہیں، درباروں سے جنم لیتے ہیں۔جو شاعر محلوں کی دہلیزوں پر بیٹھ جائیں،ان کے نصیب میں ائیر کنڈیشنڈ ہال، سرکاری اعزاز اور تصویریں آتی ہیں۔ مگر جو آدمی بھوک، دھرتی اور مظلوم کا نوحہ لکھے،اس کے حصے میں آخر کار بس اسٹاپ، فٹ پاتھ، ریلوے سٹیشن کا تھڑا اور تنہائی ہی آتی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔دور کسی درگاہ کی سمت سے شاہ لطیفؒ کا سُر ہوا میں تیر رہا تھا۔رات مزید گہری ہو گئی تھی۔ ٹھٹھہ کا ریلوے سٹیشن دو تین، چرسیوں کی رونق کے علاوہ خاموش پڑا تھا، دور کہیں سے کوئی اکا دکا لائٹ نظر آ رہی تھی مگر وہ بھی سوچ کی حد تک مدھم تھی۔کاملانی صاحب نے شاپر میں لپٹی ہوئی سوکھی روٹی اور ایک بینگن کا ٹکڑا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا''ارے صاحب کھانا کھاؤ، چھوڑو شعر و ادب اور سماج کو یہ دنیا ہے سقراط کے زہر پینے سے لے کر اکیسویں صدی تک چلتی آ رہی ہے ہمارے بعد بھی چلتی رہے گی۔''

کاملانی صاحب نے خالی نظروں سے چائے کے ٹوٹے ہوئے کپ کو دیکھا، جیسے اس میں اپنی پوری زندگی پڑی ہو۔پھر آہستہ سے اٹھے۔ان کی اجرک کا ایک کونا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔وہ چند قدم چلے، مگر اچانک لڑکھڑا گئے۔میں نے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر ان کا جسم ریت کی دیوار کی طرح میرے ہاتھوں میں ڈھہ گیا۔ گرتے ہی بولے ''معذرت یار میں زیادہ دیر گفتگو نہیں کر سکتا ،اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔اب میں سو رہا ہوں۔''

اردو اور سندھی زبان کے ادب کا اتنا بڑا ستارہ، کمزوری کی وجہ سے سڑک پر چلتے چلتے گر جاتا ہے اور اسی سڑک پر سو جاتا ہے، میں کسی سفید جزیرے میں ہوں یا قبرستان سے اٹھ کر یہ سارا خواب مری ہوئی انسانیت کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں!

میں زمین پر بیٹھا ان کا سر اپنی گود میں رکھے رہا۔ان کی آنکھیں آدھی کھلی تھیں، جیسے ابھی بھی کسی ادھورے افسانے کا آخری جملہ تلاش کر رہی ہوں۔

باقی سب آدم زاد کی طرح میں بھی دوست کو کال کر کے وہاں سے فرار ہو گیا اور اگلی صبح سندھ کی ثقافت کے عالمی دن کی تقریب تھی۔میں بھی وہاں پر مدعو تھا شہر بھر میں اجرکوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔اسٹیج پر وزیرِ ثقافت تقریر کر رہا تھا:

''سندھ اپنی تہذیب، شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے زندہ ہے۔حکومت اہلِ قلم کی قدر کرنا جانتی ہے۔''

سامعین تالیاں بجا رہے تھے۔ میرے سامنے، ملگجی شاعر، سوکھی روٹی اور سگریٹ کی ڈبیہ کے اندرونی کاغذ پر لکھے ہوئے شعر گھوم رہے تھے۔ شاید، میں یا پھر پوری سندھی تہذیب نہیں بلکہ بے حس ساری آدمیت گھوم رہی تھی۔